Fikr-o-Nasar (Islamabad) 5:2 (1967)

اسلام

باب اوّل

محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم

(ڈاکٹر فضل الرّحمٰن، ترجمہ : مظہر الدّین صدّیقی)

محمّد صلی اللہ علیہ وسلم اور وحی الٰہی

محمّد بن عبداللہ قریش کے ایک معزز مگر غریب گھرانے میں بمقام مکہ تقریباً ۵۷۰ء عیسوی میں پیدا ہوئے۔ آپؐ کے والد ماجد آپ کی پیدائش سے قبل ہی وفات پا چکے تھے، اور ابھی آپؐ نے ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ آپؐ کی والدہ انتقال کر گئیں۔ آپؐ کے چچا حضرت ابو طالب نے آپؐ کی پرورش کی۔ اگرچہ ابو طالب نے اسلام قبول نہیں کیا لیکن انھوں نے اہلِ مکہ کے مقابلہ میں، جو نئے دینِ اسلام کی مخالفت میں سرگرم تھے، آپؐ کی پُرزور مدافعت کی۔ چالیس سال کی عمر میں آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبلیغ اسلام کا حکم ملا۔ اس سے قبل آپؐ کی زندگی کس طرح گزری، اس کے بارے میں بجز اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہے کہ آپؐ ایک بڑے راست باز اور دیانت دار انسان تھے، اور آپؐ کے اندر خدا نے ایک غیر معمولی اخلاقی حِس ودیعت کی تھی، اور یہ کہ ایک مال دار بیوہ حضرت خدیجہ جو آپؐ سے عمر میں پندرہ سال بڑی تھیں اور جنہوں نے اپنا تجارتی کاروبار آپؐ کے سپرد کر دیا تھا۔ آپؐ کی دیانت داری اور دیگر اخلاقی صفات سے اتنی متاثر ہوئیں کہ اُنہوں نے آپؐ کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس وقت پچیس سال کے ہو چکے تھے، حضرت خدیجہ کی پیش کش قبول کر لی، اور اس کے بعد پھر آپؐ نے اُن کی وفات کے بعد پچاس سال کی عمر تک کوئی شادی نہیں کی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپؐ اپنی اخلاقی حسّ سے مجبور ہو کر وقتاً فوقتاً مکّہ سے باہر غارِ حرا میں عزلت گزین ہو جاتے تھے اور طویل عرصہ تک عبادت و ریاضت اور

غور و تدبر میں مصروف رہا کرتے تھے اور مذہبی اور اخلاقی تجربہ کا یہ باطنی عمل اس وقت انتہا کو پہنچا جب اسی حالتِ استغراق میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تبلیغِ اسلام کا حکم دیا۔

زمانۂ حال میں جن مصنفین نے اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی صحیح نوعیت اور اس کے مصادر کیا تھے، انہوں نے بہت سی قیاس آفرینیوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔ بہت سے مصنفوں نے اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسلام کے ظہور سے قبل یہودی اور عیسائی اثرات کے باعث عربوں کے اندر ایک مذہبی اور روحانی اضطراب پیدا ہو چکا تھا اور اس اضطراب کے نتیجہ میں، بعض لوگ عربوں کے مشرکانہ عقائد سے بیزار ہو کر توحید کے تصور سے آشنا ہو چکے تھے اور اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپؐ توحید کے تصور پر مسلسل زور دیتے رہے۔ دیگر مصنفین اس استدلال کو کچھ اور آگے لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کے علاوہ یہودی، عیسائی روایات سے کچھ اور عناصر مستعار لے کر عربوں کے لئے ایک قومی مذہب کی تشکیل کی، اور اس مذہب نے ان کے اندر کچھ ایسی تبدیلیاں پیدا کیں کہ ان میں ایک نئی توسیع کا جذبہ پیدا ہو گیا جو اس توسیع سے زیادہ منظم اور زیادہ طاقت ور تھا جس کا وقوع اسلام سے بہت پہلے سے عمل میں آرہا تھا اور جس کی علت یہ تھی کہ جزیرہ نمائے عرب کی زمین بتدریج شادابی اور سرسبزی سے محروم ہو رہی تھی۔ ایک اور نظریہ یہ ہے جس میں بظاہر بڑی دل فریبی پائی جاتی ہے کہ قرآن کی وحدانیت صحرائے عرب کی بے تنوع اور یکساں زندگی کی صدائے بازگشت تھی۔ اس آخری نظریہ کی تردید کے لئے یہ بتا دینا کافی ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام بدویت کے ماحول سے نہیں بلکہ مکہ کے تجارتی ماحول سے اُبھرا، جیسا کہ ہم نے تفصیل کے ساتھ آئندہ ابواب میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز اس حقیقت کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآن حکیم نے بدوی عربوں کی عادات و خصائل سے سخت بے زاری کا اظہار کیا ہے۔

لیکن یہ دلیل کہ اسلام سے پہلے عرب میں مذہبی بیداری کی جو لہر آئی تھی وہ اسلام کی تعلیمات پر اثر انداز ہوئی۔ نیز یہ دعویٰ کہ اسلام نے عربوں کی اس توسیع کے لئے ایک نیا موقع فراہم کیا جو زمانہ اسلام سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، یقیناً قابلِ توجہ ہیں کیوں کہ ان دلائل

میں تاریخ کے بعض واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے۔ یہ دونوں نظریات یکسر بے بنیاد نہیں ہیں، کیونکہ جن واقعات سے ان میں استشہاد کیا گیا ہے وہ فی نفسہ صحیح ہیں، لیکن اس لحاظ سے ضرور غلط ہیں کہ اسلام کے آغاز و ابتدا، یا اس کی تعلیمات کی توجیہہ ان واقعات تاریخ سے نہیں ہو سکتی۔

یہ صحیح ہے کہ عربوں کے بعض سمجھدار لوگ توحید کے تصور تک پہنچ چکے تھے مگر یہ صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں ان کا تصور وہی تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توحید ابتدا ہی سے ایک ایسی انسانیت نوازی اور سماجی اور معاشی عدل کے ایک ایسے تصور کے ساتھ منسلک تھی جس کی شدت آپ کے توحیدی تصور کی شدت سے کم نہیں تھی۔ جو شخص قرآن کی اُن سورتوں کا مطالعہ کرے گا جو آغاز وحی کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئیں وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ دونوں ایک ہی مذہبی تجربہ کے دو پہلو ہیں۔ چناں چہ قرآن کا ارشاد ہے:

آرایت الذی یکذب بالدین فذالک الذی یدع الیتیم۔ ولا یحض علی طعام المسکین۔ فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون الذین ھم یرآون و یمنعون الماعون۔ (سورہ ماعون - ۱۰۷)

"کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ سو اگر آپ اس شخص کا حال سننا چاہیں تو سنیئے کہ) وہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاج کو کھانا دینے کی دوسروں کو بھی ترغیب نہیں دیتا۔ سو اس سے ثابت ہوا کہ ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں جو ایسے ہیں (کہ جب نماز پڑھتے ہیں تو) ریاکاری کرتے ہیں اور ضرورت مندوں کو اپنے برتن بھی عاریتاً نہیں دیتے۔"

یہی تحریک تھی جو بعد میں مدینہ کی اسلامی سوسائٹی کے قیام پر منتج ہوئی۔ مفسرین قرآن لکھتے ہیں کہ اس سورت کی پہلی دو آیتیں مکہ میں اور باقی آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ لیکن یہ ابتدائی تحریک اپنی شدت اور پھیلاؤ دونوں اعتبار سے اتنی مسلسل اور مستقل تھی کہ سورت کے مکی اور مدنی حصوں میں فرق کرنا ناممکن ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر پر اصرار تھا کہ توحید الٰہی وحدت انسانیت کو متضمن ہے یعنی ایک خدا کا تصور لازماً ایک انسانی برادری کے تصور پر ختم ہوتا ہے۔ اس لئے اگرچہ یہ خیال فی نفسہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں مذہبی بیداری کی ایک

لہر آئی تھی اور توحید کا ایک موہوم سا تصور بھی پیدا ہو گیا تھا، لیکن اس امر کا کوئی قرینہ موجود نہیں کہ توحید کے اس تصور کے ساتھ معاشرتی اصلاح کا کوئی داعیہ بھی موجود تھا۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ اپنی ابتدار اور اصلیت کے لحاظ سے اسلام عربوں کا قومی مذہب تھا جس نے ان کے اندر قومی استحکام پیدا کر کے انہیں فوجی توسیع پر مائل کیا، اس کے بارے میں ہم اسی باب کے آئندہ صفحات میں بحث کریں گے۔

یہاں ہم اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں کہ توحید کے تصور یا سماجی اور معاشی عدل کے داعیہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو مکہ یا عربوں کے ساتھ خاص طور پر متعلق ہو۔ بلکہ اس کے برعکس اس داعیہ میں انسانی مساوات کا جو مفروضہ پنہاں ہے، وہ اپنی فطرت اور نوعیت کے اعتبار سے ایک بین الاقوامی اور عالم گیر داعیہ ہے جو قومیت کے حدود سے بالکل ماورا ہے۔

روایات کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی تو حسب ذیل آیات کا نزول ہوا:۔

اقراء باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقراء و ربک الاکرم الذی علم بالقلم۔ علم الانسان مالم یعلم۔ کلا ان الانسان لیطغیٰ۔ ان راہ استغنیٰ۔ ان الیٰ ربک الرجعیٰ۔

پڑھ اللہ کا نام لے کر جس نے مخلوقات کو پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو اسے معلوم نہ تھا۔ بے شک انسان نافرمانی پر اتر آتا ہے کیوں کہ وہ اپنے آپ کو ذمہ دار نہیں سمجھتا (یعنی کسی قانون کو نہیں مانتا بلکہ اپنی مرضی کو قانون بنا لیتا ہے)۔ لیکن تیرے رب کی طرف واپسی ہے۔

(سورہ علق - ۹۶)

بعثت نبویؐ کے ابتدائی دور سے متعلق جو روایات موجود ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تجربہ ایک رویاء کی شکل میں ہوا تھا یا یہ کہ اس تجربہ کے ساتھ آپؐ پر رویاء کی کیفیت بھی طاری ہوئی تھی کیوں کہ آپؐ نے اپنا تجربہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ "اس کے بعد میں بیدار ہوا"۔ جیسا جیسا وقت گزرتا گیا اور آپ نے اپنے عقائد کی بنیاد پر ایک زبردست جدوجہد کا آغاز کیا، یہ تجربہ بار بار وقوع پذیر ہونے لگا اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الہامی تجربات کے ساتھ ساتھ (جن میں آپؐ شعور

کے زیادہ گہرے مقامات سے گزرتے تھے) آپ پر بعض مخصوص جسمانی آثار و علائم بھی طاری ہوتے تھے اس واقعہ سے عہدِ جدید کے بعض مؤرخین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ (معاذ اللہ) آپ پر مرگی کے دَورے پڑتے تھے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ نظریہ واقعات و حقائق کے یکسر منافی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حالت اس وقت شروع ہوتی ہے جب چالیس سال کی عمر میں رسول اللہؐ پر نزولِ وحی کا آغاز ہوا۔ آپؐ کی ابتدائی چالیس سالہ زندگی میں اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ آپؐ پر کبھی اس قسم کے جسمانی آثار و علائم طاری ہوئے ہوں۔ دوئم روایات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حالت آپؐ پر نزولِ وحی کے ساتھ طاری ہوتی تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نزول وحی کے بغیر آپ پر یہ مخصوص جسمانی آثار و علائم طاری ہوئے ہوں ہر مرگی کی یہ شکل عجیب ہے کہ جب رسول اللہؐ کی طاقتور اور تخلیقی تحریک کے لئے آپؐ کو رہنما اصول بتائے جا رہے ہوں اس وقت تو آپؐ پر ضرور اور بالالتزام مرگی کا دورہ پڑے اور ویسے کبھی آپؐ پر اس مرض کا حملہ نہ ہو۔ ہم اس امکان کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک شخص پر مرگی کے دَورے بھی پڑیں اور ساتھ ہی اس پر بعض روحانی تجربات بھی وارد ہوں۔ لیکن اس ضمن میں جو بات اہم ہے وہ یہ کہ کبھی نہ کبھی تو ایسا ضرور ہونا چاہیئے کہ بغیر کسی روحانی تجربہ کے ایسے شخص پر مرگی کی کیفیت طاری ہو جائے خواہ مرگی کے بغیر روحانی تجربہ کا ورود نہ ہو سکے۔ آخری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ کا معاشرہ اتنا غیر ترقی یافتہ نہیں تھا کہ اس میں لوگ مرگی جیسے مرض کی شناخت نہ کر سکتے۔

اس افسانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جو مرقعہ پیش کیا گیا ہے، وہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ آپ کی جسمانی اور نفسیاتی حالت نزولِ وحی کے اوقات کو چھوڑ کر عام حالات میں معمول کے مطابق رہتی تھی کیوں کہ مرگی کا دَورہ انسان پر اس وقت پڑتا ہے جب اس کی حالت معمول کے مطابق ہو۔ نبوت اور الہام نبوی کا یہ تصوّر کہ نبی کے شعور کی سطح معمول کے مطابق ہوتی ہے ہمارے راسخ العقیدہ علماء نے واضح طور پر بہت بعد میں قائم کیا۔ پھر جب زمانہ مابعد میں نبوت کا یہ تصور قائم کر لیا گیا تو اس کے بعد اس تصور کی قصداً اشاعت کی گئی۔ مقصد یہ تھا وحی الٰہی کی معروضیت اور فرشتہ وحی کی خارجیت کا اثبات کیا جائے یعنی اس تصور کا کہ یہ وحی کوئی داخلی الہام نہ تھا بلکہ خارج سے ایک آواز آتی تھی یا فرشتہ خدا کی طرف سے پیغام لاتا تھا۔ ممکن ہے آج ہمیں یہ کوشش عقلی ناپختگی پر مبنی معلوم ہو لیکن ایک ایسے دَور میں جب کہ عقائدِ اسلام زیرِ تشکیل تھے، بعض حالات کی بنا پر ایسی کوشش عمل میں آنی ضروری تھی، بالخصوص عقلیت پسندوں

سے جو مباحث ہو رہے تھے، ان کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری تھا۔ اسی زمانہ میں بہت سی احادیث (احادیث پر دیکھیئے باب سوم) کی اشاعت عمل میں آئی جنہیں بعد میں سند قبولیت حاصل ہو گئی۔ ان احادیث میں یہ بتایا گیا تھا کہ رسول اللہؐ جبرئیل سے سب لوگوں کے سامنے ہم کلام ہوتے تھے، نیز ان میں جبرئیل کی ظاہری کیفیت کی مرقع آرائی بھی کی گئی تھی۔ یہ احادیث قرآن سے بالکل متناقض ہیں، کیوں کہ قرآن کا ارشاد ہے:۔

نزل به روح الامین۔ علیٰ قلبک لتکون من المنذرین۔

اس کو ایک امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ آپ کے قلب پر تاکہ آپ بھی منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔ (سورہ الشعراء۔ ۱۹۳)

(اس سلسلے میں مزید دیکھیئے سورہ بقرہ آیت ۹۷)۔ اس کے باوجود مسلمانوں کے ذہن میں یہ عقیدہ اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ جبرئیل کا وجود خارج میں ہے اور وحی الٰہی خارج سے رسول اللہ پر نازل ہوئی کہ اب وہ حقیقت حال سے آشنا ہونے پر آمادہ نہیں۔

یہی حال رسول اللہؐ کے باقی مذہبی تجربات کا بھی تھا۔ قرآن میں رسول اللہؐ کے ایک ایسے ہی تجربہ یا غالباً کئی ایک تجربات کا ذکر ملتا ہے، دیکھئے سورہ سبحٰن الذی آیت (۱) (سورہ والنجم آیات ۵ تا ۱۸۔ سورہ التکویر آیت ۲۳) ان تمام مقامات پر قرآن اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شے کا مشاہدہ کیا جو بالکل آخری سرے پر تھی، یا آپ نے افق پر کسی چیز کا مشاہدہ کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جو تجربہ کیا، اس میں توسیع ذات کا ایک عنصر شامل تھا۔ سورہ والنجم کی آیات ۱۱، ۱۲ میں قرآن کا ارشاد ہوتا ہے: ماکذب الفواد ما رآی أفتمٰرونه علی ما یریٰ (قلب سے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی تو کیا تم لوگ ان سے ان کی دیکھی ہوئی چیز میں نزاع کرتے ہو)۔ لیکن بعد میں جب راسخ العقیدہ گروہ نے اسلامی عقائد کی تشکیل کی تو روایات و احادیث کے ذریعہ ان تمام تجربات کو معراج کے ایک واحد جسمانی اور ذی حرکت تجربہ میں سمو دیا گیا۔ پھر اس کے بعد جو دور آیا اس میں افق کی تمام تفصیلات بتائی گئیں۔ نیز آپ نے بہشت کے مختلف مقامات کی جو سیر کی تھی، اس کے جزویات متعین کئے گئے حتیٰ کہ انبیائے سابقہ یعنی حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک سے آپ کی ملاقاتوں کا حال بھی بیان کر دیا گیا۔ یہاں ہم کو پہلے اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیئے جس کو راسخ العقیدہ گروہ کے مخالفین ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے ہیں، کوئی مذہب محض اپنے عقائد کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتا جو مادی علامات و تشابیہہ سے بالکل خالی اور مجرد روحانیت پر مبنی ہوں، بلکہ

روح کے لئے مادی پیراہن فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس وجہ سے مذہبی عقائد کے لئے یہ ضروری ہے کہ انہیں محسوسات ومشہودات کے پیرایہ میں بیان کیا جائے۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ روحانی واقعات معرضِ وجود میں نہیں آسکتے جب تک کہ ان کے ساتھ طبعی مظاہر بھی موجود نہ ہوں۔ نیز ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ایک ہی واقعہ کو اس کے سیاق اور حالات کے اعتبار سے روحانی بھی کہا جا سکتا ہے اور مادی بھی، لیکن کوئی بھی صورت ہو، اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ معراج کا جو عقیدہ (صعودِ مسیح کے نمونہ پر بالخصوص) راسخ العقیدہ گروہ نے پیدا کیا اور جس کی تائید احادیث کے ذریعہ عمل میں آئی، وہ محض ایک تاریخی افسانہ ہے جس کا مواد مختلف ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدّوجہد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے اہلِ مکہ اور بالخصوص اس دولت مند طبقہ میں مخالفت کا ایک طوفان برپا ہوگیا جو مکّی زندگی کے دروبست پر قابض تھا۔ اہلِ مکہ کو صرف یہی خوف نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے روایتی مذہب میں دست اندازی کر رہے ہیں جو مشرکانہ عقائد پر مبنی تھا۔ بلکہ آپؐ کی تعلیم سے ان کے معاشرے کے سارے نظام کو خطرہ لاحق تھا اور بالخصوص ان کے قائم شدہ تجارتی اغراض کو، کیوں کہ آپؐ کی تعلیم میں سماجی انصاف پر بہت زور دیا گیا تھا۔ اور جیسا جیسا وقت گزرتا گیا آپ ربوٰا کی مذمت اور زکوٰۃ کے قیام پر شدومد سے اصرار کرتے گئے۔ اہلِ مکّہ نے آپؐ پر طرح طرح کے الزامات لگائے کبھی کہتے کہ آپؐ کسی جن یا بھوت کے قبضہ میں ہیں۔ کبھی کہتے کہ آپؐ جادوگر ہیں۔ کبھی آپ پر یہ الزام لگاتے کہ آپ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ جیسی جیسی مخالفت بڑھتی گئی اس کی تندی میں اضافہ ہوگیا۔ غم وغصہ نے استہزاء کی شکل اختیار کر لی، اور استہزاء نے سب وشتم کی۔ وہ کہتے تھے یہ کیسا نبی ہے جو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اور کیا اللہ تعالیٰ اس بے کس یتیم کے بجائے کسی برتر آدمی کو نبی نہیں بنا سکتا تھا جو دولت مند بھی ہوتا اور زیادہ با اثر بھی۔ اس طرح یہ کش مکش تیز تر ہوتی گئی۔ اور بے دردانہ ظلم وستم اس کی خصوصیت بن گئی۔

جیسے جیسے یہ کش مکش شدت پکڑتی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ دین کے خدوخال نمایاں ہوتے گئے۔ یہ عمل اس طرح واقع ہوا کہ اوّلاً دین کے بنیادی مابعد الطبیعی مفروضات کی قطعی تشریح کی گئی اور مخالفین کے دلائل کا جواب دے کر کلامی عقائد کا ایک اساسی نظام

قائم کیا گیا۔ دوسری طرف پیروانِ اسلام پر کچھ متعین فرائض عائد کئے گئے۔ یہ فرائض خود مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو متعین کرتے تھے اور غیر مسلموں کے مقابلہ میں ان سے جس رویہ کی توقع کی جاتی تھی اس کی وضاحت بھی کرتے تھے۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو قرآن نے توحید اور معاشی اور سماجی انصاف کے بعد سب سے زیادہ جس عقیدہ پر زور دیا، وہ روزِ قیامت کا عقیدہ تھا، یعنی انسان کو بالآخر خدا کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے گی۔ انسان نہ صرف سرکش ہے بلکہ سرکشی کی عادت اس میں راسخ ہے۔ اس لئے ایک روز یومِ حساب ضرور ہوگا جب اس کے اخلاقی رویہ کی بابت پوچھ گچھ ہوگی اور ایک طرف اگر منکروں اور بدکاروں کو سخت سزا ملے گی تو دوسری طرف نیکوکاروں کو بے حساب اجر و انعام سے نوازا جائے گا۔ اس اثنا میں نبی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتا رہے، اور آنے والے دن کے عذاب سے انہیں ڈراتا رہے۔ شاید اس طرح وہ اپنی بداعمالیوں سے تائب ہو جائیں۔ قرآن نے بدکاروں کو آنے والے عذاب سے ڈراتے ہوئے عذاب کا تفصیلی نقشہ بڑے پُرزور الفاظ میں پیش کیا ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کو نماز ادا کرنے کی تاکید بھی کی ہے جو کہ ایک اہم دینی فریضہ ہے۔ ہم آئندہ باب میں ان عقائد کے درجہ بدرجہ ارتقا سے تفصیلی بحث کریں گے۔ یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے اور زکوٰۃ دینے کے دونوں طریقوں نے نہ صرف افراد پر اچھا روحانی اثر ڈالا بلکہ جماعتی ارتباط و استحکام کی ایسی اسپرٹ پیدا کی جو ایک نئی جماعت کی بقا و توسیع کے لئے نہایت ضروری ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں ایک صبر آزما کشمکش کر رہی ہو۔ اور یہ اسپرٹ آج تک امتِ مسلمہ کی خصوصیات میں داخل ہے۔

قرآن میں صرف بدکاروں اور منکروں کو یومِ حساب سے ہی نہیں ڈرایا گیا بلکہ یہ بتانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ماننے والوں پر جو ظلم و ستم توڑے جا رہے ہیں، وہ تاریخ انسانیت کا کوئی نادر واقعہ نہیں ہے، قرآن بار بار انبیائے سابقہ مثلاً حضرت ابراہیمؑ حضرت نوحؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ کس طرح ان داعیانِ حق کو بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، اور کس طرح ان کی قوم کی اکثریت نے ان کے پیغام سے بے اعتنائی برتی اور ہٹ دھرمی کے ساتھ ان کی دعوت کا انکار کیا۔ جیسا جیسا وقت گزرتا گیا، ان واقعات کی تصویر زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کی گئی اور انبیائے سابقہ کے موہوم خاکہ کے خدوخال زیادہ متعین ہوتے گئے۔

ان تفصیلات کی تاریخی صحت کس درجہ کی ہے یعنی انبیائے سابقہ کے واقعات وحالات سے جو زمانہ ماقبل اسلام زبان زدِ عام تھے، یہ تفصیلات کہاں تک مطابقت رکھتی ہیں، یہ سوال دلچسپ تو ضرور ہے، لیکن مشکلات سے لبریز بھی ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی اہمیت ومعنویت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ سوال کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ قرآن نے انبیائے سابقہ کے جن حالات و واقعات کا ذکر کیا ہے، ان کا مواد کہاں سے اخذ کیا گیا تھا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی معنویت اس مقصد میں پنہاں ہے جس کے لئے یہ مواد استعمال کیا گیا۔ اس لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس مواد سے کیا کام لینا مقصود تھا۔ قرآن نے ان حالات و واقعات کے بارے میں یہ ضرور کہا ہے کہ یہ وحی الٰہی کے منکشف کردہ حقائق ہیں لیکن جس چیز کا وحی الٰہی سے خاص طور پر تعلق ہے، وہ ان واقعات کی معنویت یا بالفاظ دیگر وہ مقصد ہے جس کی خاطر یہ واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی سے ان واقعات کا علم نہ ہوتا اور انھیں صرف وحی کے منکشف کردہ واقعات کی خبر ہوتی تو آپ کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا کہ وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ آپ کو کیا سمجھانا چاہتا ہے۔

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا، اور اگرچہ قرآن نے کئی جگہ اعلان کیا ہے کہ آپؐ کا کام صرف لوگوں کو ڈرانا ہے لیکن اس کے باوجود آپ اپنی کامیابی سے کچھ ناامید نہ ہوئے، بلکہ آپؐ کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ کامیابی کا حصول آپؐ کے فرائضِ منصبی میں سے ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ آپؐ کے سیرت نگاروں میں سے خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، کسی ایک نے بھی اس آخر الذکر امر پر کافی توجہ نہیں دی ہے۔ حالاں کہ قرآن نے کئی مقامات پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اور متعلقہ احادیث بھی آپؐ کی اس ذہنی کیفیت پر شاہد ہیں۔ لوگوں نے آپؐ کی زندگی کے منفرد خارجی واقعات پر بہت زیادہ زور دیا ہے لیکن آپؐ کی باطنی زندگی کی گہرائیوں میں جو تلاطم جاری رہا، اس کی تاریخ پر بہت کم توجہ کی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس تاریخ کو مرتب کیا جائے۔ تبلیغِ دین کا حکم ملنے سے پہلے رسول اللہؐ کے ذہن میں جس مسئلہ نے اضطراب پیدا کر رکھا تھا وہ انسان کی موجودہ حالت اور اس کے انجام کا مسئلہ تھا۔ اس پر غور وخوض کرنے کے لئے آپؐ وقتاً فوقتاً عزلت گزینی اختیار فرما لیتے تھے۔ تلاشِ حق کے سلسلے میں آپؐ کو بڑے زبردست روحانی کرب سے گزرنا پڑا، لیکن آخر کار اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر وحی نازل فرمائی۔ قرآن میں آپؐ کے اس روحانی کرب کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :-

الم نشرح لک صدرک و وضعنا عنک وزرک الذی انقض ظہرک ۔

کیا ہم نے آپؐ کی خاطر آپؐ کا سینہ کشادہ نہیں کیا، اور ہم نے آپؐ پر سے وہ بوجھ اُتار دیا جس نے آپؐ کی کمر توڑ رکھی تھی۔ (سورہ الم نشرح۔ آیات ۱ تا ۲)

(زمانہ مابعد میں روایات کے ذریعہ اس حقیقت کو ایک افسانہ کا رنگ دے دیا گیا جس میں بتایا گیا ہے حضرت جبرئیل نے آپؐ کا سینہ کھول کر اسے آلائشوں سے پاک کیا) لیکن تبلیغ دین کا حکم ملنے کے بعد آپؐ پر ایک نئی ذمہ داری کا بار ڈالا گیا یعنی یہ کہ آپؐ تبلیغِ دین کے حکم کی کامیابی کے ساتھ تعمیل کریں۔ چناں چہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کا ارشاد ہے۔

انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً۔ (سورہ المزمّل، آیت ۵)

بے شک ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں۔

اس کے بعد جو زمانہ آیا اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روح و باطن کی ساری تاریخ دو حدوں میں محصور ہے۔ ایک طرف مشرکین مکہ کے طرزِ عمل کی وجہ سے آپؐ کو مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا، جو آپؐ کے اختیار سے باہر تھیں۔ اور دوسری طرف آپؐ کی یہ سعی مسلسل تھی کہ آپؐ کا مشن کامیاب رہے کیونکہ قرآن کی تعلیمات کا یہ ایک اہم جزو ہے کہ صرف اللہ کا پیغام پہنچا کر مایوسیوں کا شکار ہو جانا روحانی ناپختگی کا ثبوت ہے۔ روحانی پختگی کے لئے ضروری ہے کہ انسان پیغام الہٰی کی اشاعت میں کامیابی سے ہم کنار ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ فکر اس امر کی تھی کہ آپؐ کا پیغام مؤثر ثابت ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں بار بار آپؐ کے اس تردّد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بات صرف آپؐ کی مکّی زندگی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ مدنی زندگی میں بھی قرآن آپؐ کی اس کیفیت کا شاہد ہے۔

ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ۔ (طٰہٰ۔ آیت ۲)

ہم نے تجھ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ تکلیف سے گھٹتے رہیں۔

فلعلک باخعٌ نفسک علی آثارھم ان لم یومنوا بھذا الحدیث اسفاً۔ (سورہ الکہف، آیت ۶)

(اور آپؐ جو ان پر اتنا غم کھاتے ہیں) سو شاید آپ اُن کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون (قرآنی) پر ایمان نہ لائیں تو غم سے اپنی جان دے دیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے یہودیوں کی بھی ویسی ہی فکر تھی، جیسی مکّی زندگی میں مشرکینِ مکہ

کی فکر تھی اس کا ثبوت قرآن کی حسبِ ذیل آیت سے ملتا ہے:۔

قل یا اھل الکتاب لستم علی شیئ حتیٰ تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل من ربکم و لیزیدن کثیراً منھم ما انزل الیک من ربک طغیاناً وکفراً فلا تاس علی القوم الکافرین۔

"آپ کہئے کہ اے اہلِ کتاب تم کسی راہ پر بھی نہیں جب کہ توریت اور انجیل کی اور جو کتاب تمہارے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہے، اس کی بھی پوری پابندی نہ کروگے۔ اور ضرور جو مضمون آپ کو آپ کے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب بن جاتا ہے، آپ ان کافر لوگوں پر غم نہ کھایا کیجئے"۔) (سورہ المائدہ۔ آیت ۶۸)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس خصوصیت کی سب سے زیادہ مؤثر مثال حسب ذیل آیات میں ملتی ہے:۔

قد نعلم انہ لیحزنک الذی یقولون فانھم لا یکذبونک ولکن الظالمین بآیات اللہ یجحدون ولقد کذبت رسلٌ من قبلک فصبروا علی ماکذبوا واوذوا حتیٰ اتاھم نصرنا ولقد جاءک من نبأی المرسلین۔ وان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقاً فی الارض اوسلماً فی السماءِ فتاتیھم بایۃ۔ (سورہ الانعام۔ آیات ۳۳ تا ۳۵)

ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کے اقوال مغموم کرتے ہیں سو یہ لوگ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار بھی کرتے ہیں۔ بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے ہوتے، ان کی بھی تکذیب کی جا چکی ہے سو انہوں نے اس پر صبر ہی کیا کہ ان کی تکذیب کی گئی اور ان کو ایذائیں بھی پہنچائی گئیں یہاں تک کہ ہماری مدد ان کو پہنچی۔ اور اللہ تعالیٰ کی باتوں کا کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔ اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈھ لیں پھر کوئی معجزہ لے آئیے (تو ایسا کر کے دیکھ لیجئے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امر کو بیحد اہمیت دیتے تھے کہ آپ کے پیغام کی مؤثر طور پر تعمیل کی جائے صرف اسی صورت میں آپ کا پیغام، پیغامِ حق بن سکتا تھا۔ اس لئے یہ امر بالکل حیرت انگیز نہیں کہ آپ کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کا جب کبھی کوئی موقعہ ملتا آپ اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ آپ کے مخالفین نے پہلے مکہ میں اور اس کے بعد مدینہ میں یہ دیکھ کر کہ آپ انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کتنے فکر مند رہتے ہیں، بعض مراعات کے عوض آپ کو کئی مواقع فراہم کئے، جن سے آپ کو اپنے اس نصب العین

کے حصول میں آسانی ہوجاتی۔ لیکن قرآن بار بار آپؐ کو اس بات سے خبردار کرتا رہا کہ آپؐ مخالفین کے ساتھ کوئی مصالحت نہ کریں۔ چناں چہ اس نے مصلحت اور مصالحت کے درمیان ایک واضح خط تفریق کھینچ دیا:۔

ودّوا لو تدهن فیدهنون۔ (سورہ القلم۔ آیت ۹)

(یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپؐ تبلیغ میں ڈھیلے پڑ جائیں تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں گے)

وان کادوا لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک لتفتری علینا غیرہ واذاً لاتخذوک خلیلاً۔ ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیهم شیئاً قلیلاً۔ اذاً لاذقناک ضعف الحیوٰة وضعف المماتِ ثم لا تجد لک علینا نصیرًا۔ (بنی اسرائیل۔ آیات ۷۳ تا ۷۵)

(اور یہ کافر لوگ آپ کو اس چیز سے بچلانے ہی لگے تھے جو ہم نے آپ پر وحی کے ذریعہ بھیجی ہے تاکہ آپؐ اس کے سوا ہماری طرف غلط بات کی نسبت کریں، اور ایسی حالت میں آپ کو گاڑھا دوست بنا لیتے اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے۔ اور اگر ایسا ہوتا تو ہم آپ کو حالتِ حیات میں اور بعد موت کے دُہرا عذاب چکھاتے۔ پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار بھی نہ پاتے)

مدینہ میں بھی آپ پر یہی واردات گزری:۔

وان الذین اُورثوا الکتاب من بعدھم لفی شک منه مریب، فلذالک فادع واستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم وقل امنت بما انزل اللّٰہ من کتاب وامرت ان اعدل بینکم اللّٰہ ربنا وربکم۔ (سورہ الشوریٰ آیات ۱۵ و ۱۴)

(اور جن لوگوں کو ان کے بعد کتاب دی گئی۔ وہ اس کی طرف سے ایسے شک میں پڑ گئے ہیں جس نے ان کو تردّد میں ڈال رکھا ہے۔ سو آپ اسی طرف ان کو برابر بلائے جائیں جس طرح آپ کو حکم ہوا ہے۔ آپ اس پر مستقیم رہیئے اور ان کی فاسد خواہشوں پر نہ چلئے اور آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں ان سب پر ایمان لاتا ہوں اور مجھ کو یہ بھی حکم ہوا ہے کہ میں عدل رکھوں۔ اللہ ہمارا بھی مالک ہے۔ اور تمہارا بھی مالک ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ اپنی تبلیغی جدوجہد کے ابتدائی دور میں جب کہ آپؐ ابھی مکہ ہی میں تشریف فرما تھے، آپؐ ایک مرتبہ ایک بااثر شخص کے ساتھ مصروف گفت گو

تھے۔ آپؐ درحقیقت اس کوشش میں تھے کہ آپؐ اپنے مقصد میں اس کو ہم نوا بنالیں۔ اتنے میں ایک نابینا شخص وارد ہوا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کی آمد پر چیں بر جبیں ہو گئے اور اس وقت اس سے ملاقات نہیں کی۔ اس پر یہ مشہور آیات نازل ہوئیں:۔

عبس و تولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ وما یدریک لعله یزکیٰ او یذکر فتنفعه الذکریٰ۔ امامن استغنیٰ فانت له تصدیٰ وما علیک الا یزکیٰ واما من جاءک یسعیٰ وھو یخشیٰ فانت عنه تلھیٰ (سورۃ عبس۔ آیات ۱ تا ۹)

(آپؐ چیں بہ جبیں ہو گئے اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا اور آپ کو کیا شاید نابینا آپ کی تعلیم سے (پورے طور پر) سنور جاتا یا (کسی خاص امر میں نصیحت قبول کرتا) سو اس کو نصیحت کرنا (کچھ نہ کچھ) فائدہ مند ہوتا تو جو شخص (دین سے) بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں حالاں کہ آپؐ پر کوئی الزام نہیں کہ وہ نہ سنورے اور جو شخص آپ کے پاس (دین کے شوق میں) دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا ہے آپ اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمتِ عملی

اوپر جو مثالیں شرح و بسط کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، ان سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا روحانی مشکل درپیش تھی۔ مکہ میں آپؐ نے اپنے گرد پیروان اسلام کی ایک مختصر مگر جان نثار جماعت جمع کر لی تھی، لیکن پھر بھی یہ بات واضح تھی کہ تیرہ سال کی لگاتار تبلیغ اور جد و جہد کے بعد آپ کی تحریک کی ترقی یکسر مسدود ہو گئی تھی۔ اور اس امر کی کوئی توقع نہیں تھی کہ آپؐ اپنے ہٹ دھرم مخالفین کے مقابلہ میں جلد ہی کوئی نمایاں کامیابی حاصل کریں گے۔ اس موقعہ پر مدینہ کے کچھ لوگوں نے (اسلام سے پہلے مدینہ کا نام یثرب تھا) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ربط پیدا کیا اور آپؐ کو دعوت دی کہ آپؐ مدینہ کے سیاسی اور مذہبی سربراہ کی حیثیت سے اس شہر میں تشریف لائیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ رسول اللہ کسی ایسے مرحلہ پر پہنچ چکے تھے جہاں آپ یکسر بے بسی کی حالت میں ہوں یا مکہ کے باشندوں نے آپؐ کی دعوت کو بالکلیہ رد کر دیا تھا، اگرچہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپؐ کی تحریک نہایت سست رفتاری سے ترقی کر رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی مزید ترقی ناممکن ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اطمینان بخش طور پر پھیل رہی ہوتی تو آپؐ مکہ سے کبھی ہجرت نہ کرتے کیونکہ اس

شہر کا حصول جو عربوں کا مذہبی مرکز تھا، آپؐ کا مقصدِ اولین تھا۔ لیکن اہلِ مکہ نے آپؐ کی دعوت کو بالکل رد نہیں کیا کیوں کہ اگر آپ مکّہ میں بالکل ناکام رہتے تو اہلِ مدینہ آپؐ کو اپنا سیاسی اور مذہبی سربراہ بنانے کا کبھی خیال نہ کرتے۔ کوئی شخص خالی جذبہ رحم سے متاثر ہو کر کسی کو اپنا لیڈر نہیں بناتا۔ اس لئے یہ بالکل یقینی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اخلاقی عظمت کے باعث اہلِ مکہ کے دلوں میں جو احترام پیدا کیا تھا، نیز آپ کے سیاسی فہم و تدبر نے اہلِ مدینہ کے دلوں کو موہ لیا، کیوں کہ وہ کسی ایسے انسان کی تلاش میں تھے جو انھیں فتنہ و فساد اور باہمی جنگ و جدال کی اس تباہ کاری سے نجات دلا سکے، جس نے مدینہ کے امن و نظم کو عرصۂ دراز سے پارہ پارہ کر رکھا تھا۔ چناں چہ اہلِ مدینہ کے ساتھ ضروری گفت و شنید کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کی مختصر مگر جاں نثار جمعیت کو ساتھ لے کر مدینہ کا عزم فرمایا۔ یہی وہ ہجرت ہے جس سے مسلمانوں کے سال کا آغاز ہوتا ہے۔

مدینہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منشور کا اعلان فرمایا، جس میں یہود کو بحیثیت ایک مستقل امت مذہبی آزادی دی گئی تھی۔ اس منشور میں مسلمانوں پر زور دیا گیا تھا کہ وہ باہم تعاون کریں، اور یہودیوں اور مسلمانوں کو بھی باہمی تعاون کی دعوت دی گئی تھی۔ جہاں تک کہ امنِ عامہ کے قیام کا تعلق تھا، منشور میں رسول اللہ کی اس حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا کہ آپ کو تمام نزاعات کا تصفیہ کرنے کا اختیارِ کامل حاصل ہوگا۔ مدینہ پہنچ کر بہت تھوڑے عرصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مکّی پیروؤں اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان ایک حقیقی اور مؤثر بھائی چارہ قائم کر دیا۔ یہ ایک ایسی کامیابی تھی جس پر قدیم اور جدید مؤرخین دونوں یکساں طور پر حیرت زدہ ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کی طرف توجہ فرمائی جو آپ کی دعوت کا سب سے مشکل مرحلہ تھا یعنی یہ کہ مکّہ کو اسلام کے زیرِ نگیں لایا جائے اور مکہ کے دینی مرکز سے اشاعتِ اسلام کا کام آگے بڑھایا جائے، اس کے بعد سے آپ کی تمام کوششیں اسی مقصد پر مرتکز ہو گئیں۔ جب تک آپؐ مکہ میں تھے، آپ نے اس شہر کو مرکزِ اسلام بنانے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن اس کے باوجود آپؐ کو کامیابی نہ ہوئی۔ اپنے اس مقصد کے حصول کی فکر میں بعض وقت آپؐ ایسی تدابیر اختیار کرنے پر بھی ذہنی طور سے آمادہ ہو جاتے تھے جن سے آپؐ کی دعوت کے بنیادی اصولوں پر ضرب پڑ سکتی تھی۔ لیکن قرآن آپ کو فوراً ایسے کسی عمل کے نتائج سے خبردار کر دیتا تھا اور آپؐ کو حکم دیتا تھا کہ آپؐ صبر سے کام لیں، یہاں تک کہ نصرتِ الٰہی کا ظہور عمل میں آئے۔ اب مدینہ میں آکر اس مقصد کا

حصول بالکل نظر کے سامنے تھا۔ کیا یہ وقت نہ تھا کہ آپؐ مزید اقدامات کرتے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وقت اس کام کے لئے مناسب نہ تھا۔ لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں پر رسول اللہؐ کی ذات کے بارے میں بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے بالخصوص مغرب کے اہل علم اور نقادوں میں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ آپ کو اس مقام پر سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مبلغِ دین جنگ و جدال پر آمادہ ہو جائے۔ ہمیں اقرار ہے کہ ہم خود اس مقام پر اہلِ مغرب کی ناکامی کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ البتہ تمام تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہم اس مفروضہ پہ ان لوگوں کی ناکامی کو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مصنفین مذہب کے دائرہ میں مایوسی، ناکامی، رنج و غم اور دار و رسن کی موت کے حسرت انگیز افسانوں کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ انہیں جہاں تک دین و مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا تعلق ہے، کامیابی کے تصور ہی سے نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن ہم نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ جہاں تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے، آپؐ میں مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد قطعاً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بجز اس کے کہ مدینہ میں حالات زیادہ سازگار تھے اور مکہؔ میں آپؐ کو یہ بات حاصل نہیں تھی حالاں کہ آپؐ اسی کے آرزومند تھے۔

اس مقام پر ہم پھر اس دعویٰ سے بحث کریں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے ذریعہ عربوں کے لئے ایک قومی دین وضع کیا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وحدانیت اور ایک سماجی اور معاشی نظام اخلاق کی طلب جو قرآن کے اندر کے ایک جذبہ محرکہ کے طور پر جاری و ساری ہے، عربوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ لیکن اس مرحلہ پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلام عربوں کا قومی دین تھا، ایک مخصوص دلیل پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مدینہ کے یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا اور آپؐ کو ان کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو آپؐ یہود کے مخالف ہو گئے اور اسلام کو عربی دین میں تبدیل کرنے کی غرض سے آپؐ نے تحویل قبلہ کا حکم دیا یعنی مسلمانوں کو بیت المقدس کی بجائے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کی تاکید کی۔ ساتھ ہی کعبہ کی زیارت یعنی حج کو اسلام کا ایک مقدس فریضہ قرار دیا۔ عام طور پر ایک مسلمان اس کے جواب میں یہی کہے گا کہ یہ تمام اقدامات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نہیں کئے بلکہ یہ سب احکام قرآن میں نازل ہوئے۔ ہم آئندہ باب کے آغاز میں رسول اللہؐ اور قرآن کے باہمی تعلق کی بابت اپنی رائے پیش کریں گے۔ یہاں ہم اس مسئلہ سے تعرّض کئے بغیر اور بحث کے اغراض کے لئے قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں کریں گے۔

یہ تاریخ کی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود مدینہ کے درمیان تصادم واقع ہوا کیوں کہ یہود نے آپؐ کی اور آپؐ کے پیش کردہ دین کی زبردست مخالفت کی اور اسی باب کے آئندہ صفحات میں ہم مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات سے بحث کریں گے بالخصوص جہاں تک مذہبی امور سے ان کا تعلق ہے۔ لیکن مغربی مؤرخین کی بڑی اکثریت نے اس بحث کے سلسلہ میں جو طرز استدلال اختیار کیا ہے، اس میں اسلام کی نشو و نما پر یہود مدینہ کے اثرات کو مبالغہ آمیز رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور بالخصوص تحویل قبلہ کے مسئلہ میں علت کو معلول پر اور معلول کو علت پر مقدم کر دیا گیا ہے۔ تحویل قبلہ کے سلسلہ میں ان مورخین نے جو دلیل دی ہے اس میں زیادہ وزن ہوتا (اگرچہ یہ دلیل پھر بھی فیصلہ کن نہ ہوتی) اگر رسول اللہ نے مدینہ پہنچنے کے بعد یہودیوں کی تالیفِ قلب کے لئے بیت المقدس کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا ہوتا۔ مگر امر واقعہ یہ نہ تھا معلوم یہ ہوتا ہے کہ آپؐ نے بیت المقدس کو اس وقت مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا تھا جبکہ ابھی آپؐ مکہ ہی میں تشریف فرما تھے اور غالباً یہ حکم اس زمانہ میں دیا گیا تھا جب کہ مسلمان کفار مکہ کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے اور انہیں کھلے بندوں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ وہ کعبہ میں بھی داخل نہیں ہو سکتے اور نہ عبادت کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں اہلِ مدینہ بلکہ سارے عربوں کے لئے مکہ کا معبد نہ کہ بیت المقدس مذہبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب مکہ میں تحویل قبلہ کا حکم دیا گیا اور مسلمانوں کو بیت المقدس کی طرف منہ پھیر کر نماز ادا کرنے کی تاکید کی گئی تو یہ فیصلہ مجبوری کے تحت کیا گیا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک واضح امتیاز قائم رہے۔ قرآن نے بالکل یہی بات کہی ہے:۔

وما جعلنا القبلة التی کنت علیھا الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیه۔

(اور جس سمت آپ قبلہ پر رہ چکے ہیں وہ تو محض اس مصلحت کے لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ کون رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے)۔ (سورہ البقرہ۔ آیت ۱۴۳)

اگر ارادہ یہ ہوتا کہ بیت المقدس کو مستقل طور پر مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا جائے تو ایسا کرنے کے لئے بظاہر معقول وجوہات تھے البتہ ساتھ ہی مذہبی اور دینی سطح پر یہود کے ان دعاوی کی تردید کرنی ضروری ہو جاتی۔ جو بیت المقدس کے ساتھ وابستہ تھے۔ ایسی تردید میں کوئی دشواری نہ ہوتی کیوں کہ قرآن نے حضرت موسیٰ کو بھی خاص یہودیت کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کا بطلان کیا اور حضرت ابراہیمؑ

کے متعلق تو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی۔ جہاں تک حج بیت اللہ کو مسلمانوں کا ایک فریضہ قرار دینے کا تعلق ہے اس کا یہودیوں کے اس رویہ سے کوئی علاقہ نہیں جو انھوں نے رسول اللہؐ اور آپ کی دعوت کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ دونوں احکام قریب قریب ایک ہی وقت میں دیئے گئے یعنی ہجرت کے ڈیڑھ سال کے اندر اندر اور جنگِ بدر سے کچھ زمانہ پہلے جو رسول اللہ کی کفّار کے ساتھ پہلی جنگ تھی اور جس میں آپؐ نے انہیں مکمل شکست دی۔

سچی بات یہ ہے کہ مدینہ میں رسول اللہؐ کی حکمتِ عملی کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ کسی طرح مکہ کو اسلام کے زیرِ نگین لایا جائے اور پھر مکہ کے ذریعہ بیرون عرب اسلام کی اشاعت عمل میں لائی جائے۔ جب تک آپؐ مکہ میں تھے اس وقت بھی آپؐ کا مقصد یہی تھا لیکن وہاں آپؐ کو وہ مواقع حاصل نہ تھے جو مدینہ میں آکر حاصل ہوئے۔ اس حکمتِ عملی پر دو فیصلہ کن عوامل اثر انداز ہوئے۔

اوّلاً مکہ عربوں کا دینی مرکز تھا اور بیرون عرب اسلام کی اشاعت اسی صورت میں ممکن تھی جب پہلے عربوں کو اسلام میں راسخ کر دیا جائے۔

دوئم اگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ اسلام لے آتا تو اس نئے دین کو بڑی زبردست قوت حاصل ہو جاتی کیوں کہ قریش کو عرب کے تمام دیگر قبائل بڑی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ مزید برآں قریش نے ان قبائل کے ساتھ معاہدے کر رکھے تھے۔ اس لئے عرب کی عام آبادی پر ان کا بڑا اثر و اقتدار تھا۔ (مسلسل)

●●